علامہ اقبال اور آدم کی خود گریزی

محمد منور

حضرت علامہ اقبالؒ نے اولادِ آدم کو خطاب کرکے بڑی دل سوزی کے ساتھ کہا تھا :

بینی جہاں را ، خود را نہ بینی !	تا چند نادان غافل نشینی !
نورِ قدیمی ، شب را بر افروز !	دست کلیمی ، در آستینی !
بیروں قدم نہ از دورِ آفاق	تو پیش ازینی ، تو پیش ازینی !

''تو دنیا کا معائنہ تو کرتا ہے مگر اپنی ذات پر نظر نہیں ڈالتا ، اے حقیقت سے بے خبر اس طرح کب تک غافل پڑا رہے گا ۔ تُو نور قدیم ہے یعنی تُو نورِ ازل کا پرتو ہے ۔ تیرا فرض ہے (جہالت) شب کی تاریکی کو روشنی میں تبدیل کر دے ، تُو ید بیضا کے مانند ہے ، مگر یہ کہ اپنی ہی آستینی میں پوشیدہ ہے ، تو اس وقت بھی تھا جب کائنات نہ تھی ، تو (اپنی ذات کی رُو سے) اس کائنات سے بڑا ہے ، اس لیے تجھے اس دور آفاق کی حدود سے باہر قدم رکھنا چاہیے ۔''[1]

گویا نور ازل کا پرتو ہونے کے باعث ، حضرت علامہ کے نزدیک ، آدم کی اہلیتوں کی کوئی حد نہیں ، آدم کے امکانات کی وسعتیں بے نہایت ہیں لیکن دکھ یہ ہے کہ آدم خود اپنی ذات سے بخوبی آگاہ ہونے اور اپنی حیثیت کو پہنچاننے کی جانب راغب نہیں ہوتا ۔ جب اسے یہ بتایا جائے کہ وہ جتنا محسوس ہو رہا ہے درحقیقت اس سے بہت ہی زیادہ ہے تو اسے پریشانی لاحق ہونے لگتی ہے بلکہ اپنی بڑائی کے تصور سے بھی خوف

۱- کلیاتِ اقبال ، حصہ زبور عجم ، ص ۱۱۹ ۔

کھانے لگتا ہے ، اگر بچے کی پشت کی جانب روشنی ہو اور سامنے دیوار تو وہ اپنے وجود سے بڑا سایہ دیکھ کر ڈر جاتا ہے ، بچے کو آپ سر سے اونچا کریں تو خوف کھاتا ہے ، وہ سر سے اوپر اچھالے جانے کی لذت سے ذرا دیر کے بعد آگاہ ہوتا ہے ۔ بڑا ہو کر بھی جب کسی اونچے مینار پر زندگی میں پہلی بار چڑھے تو اس کا دل لرزنے لگتا ہے ، گھبرانے بھی لگتا ہے ۔ آدمی کی نظروں کے سامنے یک دم وسیع میدان آ جائے جس کی وسعتیں ناپیدہ کنار معلوم ہوں تو جب بھی رعب سا طاری ہو جاتا ہے ۔ اس مرعوبیت کے باعث یہ امر ہوتا ہے کہ آدمی اپنی نظروں کی محدود فضا کے ساتھ مانوس ہو چکا ہوتا ہے ، اسے جب اچانک بلندی ، گہرائی یا وسعت سے واسطہ پڑے تو یہ صورت حال خلاف معمول یا غیر معمولی ہوتی ہے ، لب لباب یہ کہ آدمی خود اپنی حسی حدوں کے پھیلنے سے لرزتا ہے ۔

پھر اگر عالم یہ ہو کہ حواس خمسہ ظاہری کی پھیلتی ہوئی سرحدیں خوف طاری کر دیں تو آدمی داخلی حسیات کا سامنا آسانی کے ساتھ کیوں کر کرے ؟ داخلی حسیات تو اس کی حدود اور اس کے آفاق کو بہت ہی پھیلا دیتی ہیں ، یہ کیفیت مادی اور طبیعی جسم کے ساتھ ساتھ روحانی وجود کی جانب متوجہ ہونے کا نام ہے ، خارجی حسیات ایک قید خانہ ہے ، الدرونی حسیات کی طرف لوٹنا اس قید خانے سے نکلنے کا نام ہے مگر جس طرح کوئی پرندہ جو پنجرے کی فضا سے مانوس ہو گیا ہو کھلی فضا کو آسانی سے برداشت نہیں کرتا اور گھبرا کر بار بار پنجرے کے اندر کی طرف بھاگتا ہے ، اسی طرح افراد بھی حسیات ظاہری کے پنجرے میں آسودگی محسوس کرتے ہیں ، داخلی حسیات اور وجدان کی وسعت کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں رکھتے ۔ L. Margery Bazett روحانی قوی کے باب میں اس طرح روشنی ڈالتی ہیں :

"If we consider these powers that take one into the world beyond our senses, we shall find that they are extended functions of the spirit, which seeks to exceed the limits imposed upon it by the physical body and by this physical world.

To Function in that realm implies an expansion of the self, a pressure of the soul to come into its own ; and the one who contacts that greater world of supersense comes to understand

something of the character of this larger self''[۲]

جیسا کہ پہلے بیان ہوا اپنے مانوس جہان محدود کی حدود کو روحانی اور وجدانی جہان کی صورت میں وسعتوں سے نوازنا خوف پیدا کرتا ہے اس کا سبب محولہ بالا مصنفہ ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں :

''There are many who shrink from the suggestion of any real existence beyond the world of sense, and any more, who habitually live as if there were none. . . . . They are afraid of other values, because to know them would mean to have to live by them.'' [۳]

اپنی بڑی حیثیت کا علم ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسی حیثیت کی شان کے تناسب سے زندگی بسر کرنا پڑے گی ۔ انسان اپنی بڑائی کے تصور سے گھبراتا ہے کیونکہ بڑا بن کر جینا بعض ایسے مطالبے کرتا ہے جن کو پورا کرنا بے پناہ بے آرامی سے ہمکنار ہونے کے مترادف ہے ، آدمی مٹی سے پیدا ہوتا ہے اور حضرت علامہ کے بقول شروع شروع میں اس کے وجود کا مادی و خلقی پہلو حاوی بھی رہتا ہے ۔[۴] اس لیے وہ مٹی کے قریب ہی رہنے میں سُکھ محسوس کرتا ہے یہ جامدی اور نباتی وجود ہے ، خاکستان سے دوری بے آرامی کا باعث بنتی ہے ، حیوان کو حرکت کرنا پڑتی ہے ، رزق کی تلاش میں اپنی جگہ چھوڑنا پڑتی ہے ، دوڑ بھاگ کرنا لازم ہو جاتا ہے ۔ تاہم حیوانی سطح بھی جبلی سطح ہے یا یوں سمجھیے کہ متحرک مشین کی سطح ہے ، زمین ہی کے ساتھ رابطہ رہتا ہے ، زمین ہی میں خوراک ڈھونڈنا اور جیسی صورت میں خوراک ملے اسی صورت میں گھانا ، کوئی چولھا ، ہنڈیا اور مرچ مسالہ نہیں جس کا تکلف کرنا پڑے ، کوئی حقوق و فرائض کا جھگڑا نہیں ، گویا حیوانی سطح جامدی اور نباتی سطح کے مقابل بے آرام ہونے کے باوصف انسانی سطح کے مقابل نہایت پُر سکون سطح ہے ۔ کوئی حیوان مرضی کا مالک نہیں ، اختیار و شر اس کی دسترس میں نہیں لہذا کوئی حیوان ارتکابِ گناہ نہیں کر سکتا ، دو پاؤں

۲- "Beyond the five senses" Basil Blackwell Oxford, p. 12.

۳- Ibid, p-1

۴- Reconstruction p. 106.

کے معاشرے میں جب کوئی فرد دوسروں سے بہت بلند واقع ہو تو دو صورتیں جلوہ گر ہوتی ہیں ۔ یا تو معاشرہ اپنے فرد کو فرید یا منفرد پا کر اس کا دشمن ہو جاتا ہے ، جیسے پیغمبروں اور ہادیوں کا ہوتا رہا یا فائق افراد کے بت بنا لیتا ہے اور پوجا کرنے لگتا ہے ، ڈاکٹر محمد حسین ہیکل کے بقول ''وقت کے ساتھ ساتھ جوں جوں معاشروں کا ذہنی اوسط بلند ہوتا جاتا ہے ، توں توں فائق افراد کی استثنائی حیثیت کم ہونے لگتی ہے اور وہ دیوتا کی سطح سے اتر کر عام انسانی سطح سے قریب ہونے لگتے ہیں'' ۔۵ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکابر کے وہ جوہر جو کبھی کرامات دکھائی دیتے تھے رفتہ رفتہ محض کمالات رہ جاتے ہیں ۔ ان میں کوئی عنصر خارق عادت یا غیر معمولی دکھائی نہیں دیتا ، آخر افراد آدم کے کرامات ہیں کیا ؟ Dr Harley Williams لکھتے ہیں :

''A miracle might be described as an abnormal transfer of normal energy —— a marvel, an oddity, a rarity —— but within the rules, yet spontaneous and unpredictable''.[٦]

گویا معمول کی کوئی انسانی طاقت اگر غیر معمولی اور خارق عادت انداز میں جلوہ گر ہو تو اسے کرامت تصور کر لیا جاتا ہے ، وہ ایک حیرت ناک بات ، اعجوبہ اور نادر امر قرار پاتی ہے تاہم وہ قواعد کے اندر ہوتی ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں برجستگی پائی جاتی ہے اور پیش گوئی کے دام سے آزاد ہوتی ہے ، عام انسانی توسط سے بالا یا برخلاف کسی چیز کا وقوع پذیر ہونا کرامت ہے مگر وہ کوئی بھی شے ایسی نہیں ہوتی جو محال اور بے اصول ہو ۔ ایسے غیر معمولی اعمال کو منظر عام پر لانا انسانی دسترس سے باہر نہیں ، اس لیے یہ محال اور بے اصول اور بے ضابطہ امر نہیں ، فرق محض اتنا ہے کہ کسی آدمی کے یہاں یہ اہلیت نسبتاً زیادہ ہوتی ہے اور کسی کے یہاں کم ، کہیں اس اہلیت کو تربیت دینے پر زیادہ زور صرف ہوتا ہے اور کہیں کم ۔ یہ وہ بات ہے جو ہر انسانی طاقت و اہلیت کے باب میں کہی جا سکتی ہے ، یہ وصف زید میں قدرے زیادہ تر اور وہ

۵۔ الایمان والمعرفۃ والفلسفۃ ، دارالمعارف قاہرہ ، ص ۱۳۶ ، ۱۳۷ ۔

٦۔ ''A Doctor Looks at Miracles, Antony Blond London, ed, 1959 p. 11.

وصف بکر میں مقابلتاً کم تر ، اور بس ، وجدانی امکانات ہر انسان میں موجود ہیں ، کمی بیشی کے ساتھ ، مگر یہ امکانات متوسط درجے کے عام انسانوں کی دسترس سے بعید نہیں ، بشرطیکہ وہ ان امکانات کی جانب متوجہ ہوں اور ان کی تربیت کا اہتمام کریں ، یہ الگ بات ہے کہ آدمی اپنے معمول کا قیدی ہو کر رہ جاتا ہے ۔ چونکہ حواس خمسہ ظاہری ہی سے اس کا کام چل رہا ہے لہذا ان سے آگے بڑھنا از رہ عادت ، پسند نہیں ، جس طرح اب وہ سائنسی ہتھیاروں ، اوزاروں اور آلوں کا عادی ہو گیا ہے ۔ اور بہت سے معاملات میں اپنے جوہری قویٰ سے کام لینے کے بجائے آلات کا سہارا لینے لگا ہے ۔ پہلے یہ چکھ کر دواؤں کے اجزائے ترکیبی بتا سکتا تھا اب تجزیے کے لیے مشین پر اعتماد کرتا ہے ۔ پہلے لمس سے بخار معلوم کر لیتا تھا ، اب تھرمامیٹر کا محتاج ہے ، پہلے بڑی سے بڑی گنتی خود کر لیتا تھا ، ضرب تقسیم میں ماہر تھا ۔ اب کمپیوٹر سے کام لیتا ہے ۔ گویا پہلے اپنے ظاہری حواس کا قیدی تھا اب ساتھ ساتھ سائنسی اوزاروں کا بھی قیدی ہو کر رہ گیا ہے ، بالفاظ دیگر یوں کہہ لیجیے کہ آدمی اپنے ہی بنائے ہوئے اوزاروں کے لیے خود ایک اوزار کی حیثیت اختیار کر گیا ہے ، یوں دیکھیں تو ماننا پڑتا ہے کہ سائنسی ایجادات نے آدمی کو اپنے من سے مزید دور کر دیا ہے ، اشیاء کے برجستہ فہم کی اہلیت مزید پس پردہ چلی گئی ۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان کے پوشیدہ امکانات کے باب میں اب انکار اگر شدید تر ہو جائے تو عین معمول کے مطابق ہوگا ۔ پہلے نادرالوقوع کمالات کو کرامات کہہ دیا تھا ، اب سرے سے انکار کر دیا جاتا ہے ، اور انکار کی اساس یہ کہ ہماری سائنس یہ اور یہ نہیں بتاتی ، انکار کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ سائنس کی مشینیں آدمی کی تخلیق ہے ، اور آدمی خدا کی تخلیق ، آدمی کو اللہ نے کسی ذرۂ قدسی سے بھی نوازہ ہے ، اور اسے محض روحانی قوت کی روشنی کے ذریعے دیکھا یا جا سکتا ہے ، سائنس ایک ہتھیار ہے جو حواس خمسہ ظاہری کا مددگار ہے ، اور جس پر انحصار کرنے کے بعد خود حواس خمسہ ظاہری بھی اپنی اصلی اہلیت اور قابلیت کو ضعیف کر لیتے ہیں ، آدم ان سائنسی آلات سے خود شناسی کا کام کیوں کر لے ؟ امکانات آدم کی توسیع آلات کے توسط سے نہیں ہو سکتی ، اس کے نہانی امکانات ، روحانی قوت کی افزائش کے باعث فہم کی دسترس میں آ سکتے ہیں ، حضرت علامہ فرماتے ہیں :

''ہم اپنے بالمقابل جس حقیقت سے دو چار ہوتے ہیں اس سے ربط و اتصال کا ایک بالواسطہ طریق یہ ہے کہ اس کی آیات کے مشاہدے میں جیسا کہ ادراک بالحواس سے ان کا انکشاف ہوتا ہے ، غور و تفکر سے کام لیں ۔ اور یوں ان پر دسترس حاصل کرنے کی کوشش کریں ، لیکن اس کا ایک دوسرا طریق یہ ہوگا کہ حقیقت سے ، جیسا کہ اس کا انکشاف ہمارے اندرون ذات میں ہوتا ہے ، براہِ راست تعلق پیدا کیا جائے ، لہذا قرآن پاک کی فطرت پسندی محض اس امر کا اعتراف ہے کہ انسان فطرت سے وابستہ ہے اور یہ وابستگی چونکہ ایک امکانی ذریعہ ہے قوائے فطرت پر غلبہ حاصل کرنے کا ، اس لیے ہمیں چاہیے اس کا استعمال بے روح تغلب کی بجائے اس مقصد عظیم کے لیے کریں کہ ہمیں اپنی روحانی زندگی میں آزادی کے ساتھ مدارج کمال کی طرف بڑھنا ہے یہی وجہ کہ حقیقت مطلقہ کے تمام و کمال بقا کی خاطر ادراک بالحواس کے ساتھ ساتھ اس چیز کے مدرکات کا اضافہ بھی ضروری ہے ، جسے قرآن پاک نے فواد یا قلب سے تعبیر کیا ، ـــ قلب کو ایک طرح کا وجدان یا اندرونی بصیرت کہیے جس کی پرورش مولانا روم کے دلکش الفاظ میں نورِ آفتاب سے ہوتی ہے اور جس کی بدولت ہم حقیقتِ مطلقہ کے اُن پہلوؤں سے اتصال پیدا کر لیتے ہیں جو ادراک بالحواس سے ماوراء ہیں ۔ ''[۷]

آدمی محض مادی وجود نہیں ، وہ بہت کچھ اور بھی ہے ، اگر مادی وجود بھی ہوتا تو وہ خود اپنا خالق نہ ہونے کے باعث حواس ظاہری کی مدد سے ادراک ذات نہ پہنچتا ، حقیقت کا عرفان ذات خداوندی کی معرفت کے بغیر ممکن نہیں ۔ خدا کی کائنات کو خدا ہی کے عطا کردہ نورِ وجدان کی مدد سے جانا جا سکتا ہے ، ورنہ ''پردہ داری ہی پردہ داری ہے'' کا لا یختم سلسلہ ہے ۔ Lincoln Barnett کا بیان ہے :

''He (man) does not understand the vast veiled universe into which he has been cast for the reason that he does not understand himself. He comprehends but little of his organic process and even less of his unique capacity to perceive the world about him, to reason and to dream. Least of all does he understand is his noblest and most mysterious faculty ; the ability to transcend himself and perceive himself in the act of

---

۷۔ تشکیلِ جدید ، صفحات ۲۲ ، ۲۳ ۔

perception."[۸]

آدمی کی یہ اہلیت کہ وہ اپنی ذات سے بھی وراء و بالا ہو سکتا ہے اسے اس قابل بناتی ہے کہ وہ اپنے ادراک کے عمل کا ادراک کر سکے، وہ خود اپنے اعمال کا جائزہ بھی لے سکتا ہے اور تجزیہ بھی کر سکتا ہے - یہی نہیں خود اپنے مدرکات کی بھی چھان پھٹک کر سکتا ہے - اس کا مطلب واضح ہے کہ وہ فقط مادی وجود نہیں - اس کے خاکی پیکر میں کوئی شے ہے - جو اوپر سے تشریف لائی ہے - آدمی نہ صرف روح ہے اور نہ صرف بدن بلکہ وہ روح و بدن دونوں سے برتر کوئی ہستی ہے - اس لیے کہ وہ کہتا میری روح ، میرا بدن ، میری جان ، میری دانش ، میری فکر ، میرا دماغ ، میرا دل ، میری دیوانگی ، میری حماقت و علیٰ ہذا لقیاس ـــ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ میں کون کہتا ہے - یہ روح و بدن کی ملکیت کا دعوے دار میری روح ، میرا بدن کہنے والا کون ہے ؟ ـــ یہ ''میں'' حقیقت ہے ، اس کا عرفان باہر کی طرف دیکھنے سے حاصل نہ ہوگا ، اندر دیکھنے سے ہوگا - حضرت علامہ فرماتے ہیں :

اگر گوئی کہ من وہم و گماں است
نمودش چوں نمود این و آن است
بگو با من کہ دارائے گماں کیست؟
یکے در خود نگر آن بے نشاں کیست ؟
جہاں پیدا و محتاج و لیلیٰ !
نمی آید بہ فکر جبرئیلے
خودی پنہاں ز حجت بے نیاز است !
یکے اندیش و دریاب این چہ راز است
بہ خود گم بہر تحقیق خودی شو
انا الحق گود صدیقِ خودی شو[۹]

اگر تو یہ جانتا ہے کہ ''میں'' صرف وہم و گماں ہے اور اس کا ظہور

۸- The Universe and Dr. Einstein, A Mentor Book— (1954), p. 127 -

۹- کلیات اقبال ، حصہ زبور عجم ، صفحات ۱۷۰ ، ۱۷۱ -

بھی صرف ''اِس'' اور ''اس'' کا مصداق ہے تو پھر مجھے یہ بتا کر کہ صاحبِ گمان کون ہے (یہ گمان کا اظہار کرنے والا کون ہے یہ کون بول رہا ہے) تو ذرا خود اپنے اندرون میں جھانک کر دیکھو تاکہ پتہ چلے کہ وہ جس کا کوئی نشان نہیں وہ کیا ہے؟ دنیا ظاہر ہے اس کے باوصف وہ اپنے اثبات کے لیے محتاج دلیل ہے اور وہ دلیل کسی جبریل کو بھی نہیں سوجھ سکتی لیکن خودی (من، میں) پوشیدہ ہو کر بھی دلیل سے بے نیاز ہے، ذرا غور تو کر آخر یہ راز کیا ہے؟ — تحقیق خودی کے لیے اپنے آپ میں ڈوب جا، اور پھر پورے یقین کے ساتھ انا الحق کا نعرہ لگا، پورے یقین کے ساتھ اپنے ہونے کی صداقت کا اعلان کر، یہ تصدیق خودی صدیق بن کے کر)۔

واضح ہوا کہ حضرت علامہ کے نزدیک خودی 'من' یا 'انا' حق ہے اور اس کا عالمِ ظواہر سے کوئی تعلق نہیں، اس کیفیت سے Lord North bourn ان الفاظ میں متعرّض ہوتے ہیں:

"I am not anything that I can observe or feel or think about, since observation sensation and mentation imply a duality between myself and some subject that is not myself. We commonly speak of *my body* or *my soul* as we speak of *my feelings* or *my hand* or *my dog*. I am certainly nothing that I can be said to possess. Then who or what is the '*I*' that says these things. It is not my body. It is not my soul. . . . what am I?"[۱۰]

حضرت علامہ نے مختصر الفاظ میں آدم کی ماہیت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

طلسمِ بود و عدم جس کا نام ہے آدم
خدا کا راز ہے، قادر نہیں ہے جس پہ سخن
زمانہ صبحِ ازل سے رہا ہے محوِ سفر
مگر یہ اس کی تگ و دو سے ہو سکا نہ کہن!
اگر نہ ہو تجھے الجھن تو کھول کر کہہ دوں
وجود حضرتِ انسان، نہ روح ہے، نہ بدن![۱۱]

۱۰- "Religion in the Modern World," Suhail Academy, Lahore, p. 76

۱۱- کلیات اقبال، حصہ ضربِ کلیم، ص ۵۷ -

یہ راز کسی دلیل و برہان سے نہیں کھلتا کہ ایک وجود جو روح کو بھی اپنی ملکیت بتائے اور بدن کو بھی اور عقل کو بھی ، دل کو بھی دماغ کو بھی حتیٰ کہ کہے ''میرا وجدان کہتا ہے وہ کچھ تو نہیں ہو سکتا جس کا وہ مالک ہے ۔ انسان کو اتنا بڑا راز بنایا ۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ عقل اور اس کے دلائل اور ان دلائل کے پیدا کردہ فلسفے انسان کی حقیقت کو گرفت میں نہیں لا سکتے ، یہ اس کی وجدانی اور روحانی اہلیت ہے جو اسے نسبتاً زیادہ قربِ حقیقت بخش سکتی ہے لیکن یہ وجدان اس حقیقت کے قریب فقط اس دم پھٹک سکتا ہے جب وہ خدائے خلاق پر کامل ایمان رکھتا ہو اور اس کا پختہ اعتقاد ہو کہ وہ نور مطلق کے کسی کھربویں کے کھربویں حصے کو یا اس کے پرتو کو اپنے اندر کیے ہوئے ، جیسا کہ حضرت علامہ نے فرمایا :

نقطۂ نورے کہ نام او خودی
زیرِ خاک ما شرار زندگی است[۱۲]

یہ نور اگر آدم کے حیوانی وجود سے مغلوب ہو جائے اور اس طرح عالمِ خلق کے مادی بوجھ تلے دب جائے اور دبا رہے تو وہ ایک عقلمند دو پایہ بن سکتا ہے اور ایک دوپائے کی حیثیت سے خوش گفتار خوش خیال اور خوش فکر تو بن سکتا ہے ۔ مختلف علوم میں دسترس بھی حاصل کر سکتا ہے مگر خود اسے اپنی ذات سے آگاہی میسر نہیں ہو سکتی ۔ اسے اپنی ذات سے آگاہی ''نور مطلق'' سے آگاہی کی بدولت ہی میسر آ سکتی ہے ۔ بجا فرمایا :

خودی کا سرِّ نہاں لا الہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الہ الا اللہ[۱۳]

مراد یہ ہے کہ آدمی کا 'من' یا خودی یا ذات استحکام پزیر ایک خدا پر کامل ایمان لائے بغیر اور دیگر ہر شے سے منہ موڑے بغیر ممکن نہیں ، اس لیے اگر آدمی صرف مادہ نہیں ، صرف روح بھی نہیں تو ظاہر ہے کہ وہ کوئی ایسی شے ہے جو جملہ کائنات سے بالا ہے ۔ فقط خدا سے نیچے ہے اور ظاہر ہے کہ اسے کوئی ایسی ہی شے ہونا بھی چاہیے تھا ۔ ورنہ

۱۲۔ کلیات اقبال ، حصہ اسرار و رموز ، ص ۱۸ ۔
۱۳۔ کلیات اقبال ، حصہ ضرب کلیم ، ص ۱۵ ۔

وہ شے اس آیۃ کریمہ کا مخاطب کیوں کر بن سکتی تھی ۔

و لقد سخرنا لکم ما فی السموات و ما فی الارض جمیعاً منہ۱۴

(ہم نے زمین اور آسمانوں میں جو کچھ بھی ہے تمھارے لیے مسخر کر دیا ہے) ۔

قدرتی امر ہے کہ جب آدم کی سمجھ میں یہ نکتہ آ جائے کہ آدم خدا کا نائب ہے اور وہ کائنات میں موجود ہر طاقت کو مغلوب و مسخر کرنے کے قابل ہے تو پھر وہ ایک خدا کے سوا کسی اور کے سامنے جھکنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا ۔ خدا کے حضور میں سجدہ اسے اپنے خدا سے قریب کرتا ہے ، ''و اسجد واقترب''۱۵ اور ماسوا حضور کے اس کا سجدہ اسے مخلوق کا اسیر بنا کر خدا سے دور کر دیتا ہے ۔ حضرت علامہ کے نزدیک خود شناسی کا تقاضا ہی یہ ہے کہ آدم دنیا کی لذتوں ، قوتوں اور فکری فریب کاریوں کا غلام ہو کر نہ رہے ، وہ مسخر کرتا چلا جائے ، جب وہ مادی بندھنوں میں مقید نہ رہے گا ۔ کسی دولت کا ، کسی ہوس کا ، حتٰی کسی گمراہ کن فلسفے کا بھی غلام نہیں رہے گا تو یہ ثبوت ہوگا اس امر کا کہ وہ توحید کا معنٰی سمجھ گیا ہے :

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا۱۶

واضح رہے کہ ہمارے دلائل مادی کائنات کے ناقص مشاہدے اور نامکمل فہم کا عطیہ ہیں ۔ ہمارے اسالیب بیان مادی مناظر اور مادی ملاحظات پر مبنی ہیں ۔ پھر وہ ورائے مادہ کوائف کو حیطۂ بیان میں کس طرح لائیں ۔ اور جو کچھ ورائے مادہ ہے وہ مادی کلمات اور ان کلمات کی ساختہ اور پرواختہ دلیل کی مدد سے معرضِ اظہار میں کس طرح آئے ۔ آدمی تو اتنا عاجز ہے کہ وہ غم اور خوشی کے احساس کو واضح کرنے کے لیے مناسب کلمات نہیں رکھتا چنانچہ جو خوشی سے خود واقف نہ ہو وہ

۱۴- قرآن حکیم ۱۳/۴۵ -
۱۵- ایضاً ۱۹/۹۶ -
۱۶- کلیات اقبال حصہ بالِ جبریل ، ص ۲۲ -

خوشی کا لفظ سن کر آگاہ نہیں ہو سکتا کہ معنیٰ کیا ہے ۔ اس طرح جو غم سے آگاہ نہ ہو غم کا لفظ سن کر کچھ نہیں جان سکتا کہ غم کیا ہے ، ہمارے فلسفے کی ساری فصاحت عاجز آ جاتی ہے ۔ پھر وہ کیفیتیں جو روحانی ہیں اور سرے سے ورائے مادہ ان کی گنہہ تک آدم عطائے مادہ فکریات اور عقلیات کے سہارے کیسے پہنچے ۔ یہ سارے وسائل محدود رسائی کے مالک ہیں ۔ کائنات کی کلیت کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے ۔ لہذا ورائے کلیات کے باب اور بھی بے بس ہیں ۔ اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں :

''اقبال کا کہنا ہے کہ ہمیں اشیا کا علم جزوی طور پر عطا کرتی ہے ، براہ راست نہیں عطا کرتی ۔ اس کے برعکس وجدان کے ذریعے ہمیں حقیقت کا کلی علم حاصل ہو جاتا ہے اور یہ علم سریع اور نفوذ کرنے والا ہوتا ہے ۔ اقبال برگساں کے برخلاف ، عقل کے کلیتاً نقیض نہیں ہیں بلکہ زندگی کے معمولات میں اس کے مخصوص وظیفے اور اس کی افادیت کو ایک حد تک تسلیم کرتے ہیں ۔ وہ علم کی طرف افقان و خیزاں بڑھتی ہے اور حقیقت کو اس کے اجزائے ترکیبی میں تحلیل کر کے اس کا عرفان بخشتی ہے ۔ وجدان اس کے مقابل چشم زدن میں حقائق کے سینے میں اتر کر ان کے سب راز تمام و کمال ہم پر منکشف کر دیتا ہے'' ۱۷۔

یہ احاطہ پسند وجدان اور کلیت گر وجدان اس وقت تک مہیا نہیں ہوتا جب تک معرفت خداوندی میسر نہ ہو ۔ اس لیے کہ خالق اعصار و فگارندہ آفات'' اسی کی ذات ہے عقل زیادہ سے زیادہ کائنات مادی کے ظواہر تک پہنچ سکتی ہے ، حالانکہ حقیقت مطلقہ کے مقابل یہ ادنیٰ مخلوق ہے اور اس کی اصلیت یہی کچھ ہے ۔ ''حقیقت'' فقط ایک ہے ۔ لہذا علامہ اقبال نے زمان و مکاں تک محدود رہ جانے کو زنار داری قرار دیا ہے ۔

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں ! لا الہ الا اللہ ۱۸

جب علم و عقل کی منزل عبور کر کے وجدان کے نور تک رسائی ہوتی ہے تو پھر آدمی کو وہ ہتھیار ہاتھ لگتا ہے جو اسے زمان و مکاں کا زناری نہیں رہنے دیتا ، عقل اور خرد کی اپنی مجبوریاں ہیں ، ان کی اپنی افادیت

۱۷۔ نقش اقبال ، مکتبہ جامعہ ، نئی دہلی ، ص ۳۸ ، ۳۹
۱۸۔ کلیات اقبال حصہ ضرب کلیم ، ص ۱۵

ہے ۔ مگر پھر ان کی اپنی ایک حد ہے ، جس کے آگے وہ نہیں جا سکتی ۔ حضرت علامہ نے نہ جانے یہ خیال قلمبند کرنے سے قبل کس قدر سوچا ہو گا :

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں[۱۹]

لیکن خودی کا جوہر نور یہ ہے ۔

خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند !
سمندر ہے اک بود پانی میں بند !
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے !
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے[۲۰]

زمان و مکاں میں رہ جانے والی خرد ہو یا آستان تک پہنچنے والی دانش اسے ''حضور'' کی لذت اور نعمت میسر نہیں ۔ خود رس انسان ہی خلوت کدۂ قدسی کا منظر دیکھ سکنے کا اہل ہے اور پھر اسی خلوت کدۂ قدسی کے کے انوار کی نسبت سے معرفت ذات پر بھی قادر ہو سکتی ہے ، مگر ظاہر ہے ''مطلق'' کا پرتو ''طلسم زمان و مکاں توڑ کر'' ہی آگے بڑھے گا

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبت آشنا طلب
ہم زخدا خودی طلب ہم زخودی خدا طلب[۲۱]

اور حق یہ ہے کہ آدم کے اندر وہ صلاحیت موجود ہے کہ حقیقت کا ایک وجدانی حظ حاصل کر سکے ، فقط یہ کہ فکری ، نظری ، معاشی ، جبلی ، خاکی ، طبعی و علی ہذا — جملہ استحانات میں سے گزرنا پڑتا ہے - اس مشقت سے آدم گھبراتا ہے ۔ یا یوں کہیے کہ اپنی عظمتوں کے تصور سے بھی اس کا دم گھٹنے لگتا ہے ۔ اپنی حسیات اور عقلیات کے قید خانوں سے نکلنے کی جرأت کہاں ، ورنہ کائنات تو خودی کی تکمیل میں ممد ہے ۔

۱۹- کلیات اقبال حصہ بال جبریل ، ص ۴۳

۲۰- ایضاً ص ، ۱۲۷ ، ۱۲۸

۲۱- کلیات اقبال حصہ زبور عجم ، ص ۱۱۵

ہر امتحان ایک نعمت ہے جو خود اعتمادی پیدا کرتا ہے اور اگلی منزل تک پہنچاتا ہے - حتیٰ کہ ابلیس کا بھی اگر اس اعتبار سے مطالعہ کیا جائے تو ایک پوشیدہ نعمت ہے ، اس لیے کہ وہ آدمی کو کسوٹی مہیا کرتا ہے - آدمی ہر دم یہ سوچ سکتا ہے کہ میں کتنا راہ سے ہٹا ہوں - کتنا پستی کی طرف گرا ہوں ، کتنا بلندی کی جانب بڑھا ہوں ، ابلیس ایک خدائی ممتحن ہے - اگر وہ نہ ہوتا تو ہمارے ایمان کی سخت جانی کہاں آزمائی جاتی - بہر حال علامہ اقبال عجب سرمستی کے عالم میں فرماتے ہیں -

ہر اک منتظر تیری یلغار کا — تیری شوخیٔ فکر و کردار کا
یہ ہے مقصد گردش روزگار — کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار
تو ہے فاتح عالم خوب وزشت ! — تجھے کیا بتاؤں تیری سرنوشت !
حقیقت پہ ہے جامہ حرف تنگ ! — حقیقت ہے آئینہ ، گفتار زنگ !
فروزاں ہے سینے میں شمع نفس ! — مگر تاب پرم گفتار کہتی ہے بس !
اگر یک سر موے برتر پرم ! — فروغ تجلی بسوزد پرم [۲۲]

بات حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جا کر ختم ہوئی - معراج منہائے ارتقائے آدم ہے اور یہ خودی کی تکمیل کے لیے جادۂ ایمان و یقین ہے - حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات قدسی صفات میں خودی کا مگر جلوہ گر ہوئی - لہذا طلسم زمان و مکاں ٹوٹ گیا - بقول علامہ

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں [۲۳]

خدا نے آدم کے اندر قدسی انوار کا پرتو ڈالا اور ایسے انوار کو جذب کرنے کے قابل بنایا گیا - کائنات کی گردش اس کی تربیت پر مامور ، صراط مستقیم کے رہبر اکمل صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ سامنے توحید کا سبق قرآن اور سیرت میں موجود — پھر اگر آدمی اپنے اصل وجود تک پہنچے ، اپنی لا محدودیت کی شان اور بان تک رسائی حاصل نہ کرے تو قصور کس کا ؟ مگر آدمی خود شناسی کا بار برداشت نہیں کر سکتا وہ خود اپنے امکانات سے مرعوب ہو کر بھاگ اٹھتا ہے وہ شاید خدا کا

۲۲- کلیات اقبال حصہ بال جبریل ، ص ۱۲۸ ، ۱۲۹
۲۳- ایضاً ، ص ۱۸

بھی منکر اس لیے ہو (غیر شعوری طور پر سہی) کہ کہیں اس حوالے سے خود اپنی ذات تک رسائی کا مرحلہ مشکل طے نہ کرنا پڑ جائے - اس کے لیے حوصلہ درکار ہے - اپنی حقیقت کا سامنا مشکل ، اپنی ذات تک پہنچنے سے قبل ہی سفر زندگی سے بے زار ہو جانے والے پر علامہ اقبال ان الفاظ کی مدد سے اظہار افسوس کرتے ہیں :

اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی ، لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی !۲۴

۲۴- کلیات اقبال حصہ بال جبریل ، ص ۱۶۵